© rasailojaraid.com

محمد عطاء اللہ صدیقی

قاتل بسنت!

ایک گستاخ رسول ہندو نوجوان حقیقت رائے دھری کی یاد میں آج سے تقریباً دو سو سال پہلے شروع ہونے والے بسنت کا تہوار اب محض تفریح نہیں رہا بلکہ اپنی تباہ کاریوں کے اعتبار سے ''قاتل بسنت'' کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اخبارات میں بسنت کے نتیجہ میں ہونے والی قیمتی جانوں کے ضیاع کی لرزہ خیز خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ ۱۲ فروری ۲۰۰۱ء کے قومی اخبارات میں مختلف واقعات میں تین اموات رپورٹ ہوئی ہیں۔ پہلے خبر ایک تین سالہ معصوم بچے کی ہے جو پتنگ کی ڈور سے شہ رگ کٹنے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔ تفصیلات کے مطابق نیو اسلامیہ پارک کا رہائشی اشفاق احمد اپنے دوست کی عیادت کر کے گھر واپس آ رہا تھا اور تین سالہ عبداللہ یاسر موٹر سائیکل کی ٹینکی پر بیٹھا تھا کہ کوئی پتنگ کی تیز دھار ڈور نے اس کی زندگی کی ڈور کاٹ دی۔ معصوم بچہ اپنے باپ کی گود میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ گیا۔ بدنصیب باپ اپنے لخت جگر کی کٹی ہوئی شہہ سے بہتے لہو کو ہاتھ رکھ کر روکنے کی کوشش کرتا رہا بچے کو شیخ زید ہسپتال لایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ معصوم عبداللہ یاسر کی لاش گھر پہنچی وہاں کہرام برپا ہو گیا۔ (روزنامہ ''نوائے وقت'' جنگ، انصاف ۱۲ فروری ۲۰۰۱ء) بچے کی والدہ صبیحہ بیگم جو انتہائی متقی اور پارسا خاتون ہیں اور محلے کی بچیوں کو فارغ اوقات میں قرآن وحدیث کی تعلیم دیتی ہیں، اچانک اپنے لخت جگر کی اس حادثاتی موت کا سن کر حواس باختہ ہو گئیں۔ بدقسمت ماں کی آہ وزاری اور بین ڈالنے کی آنکھوں دیکھا حال ایک قریبی ہمسائے ڈاکٹر حافظ فاروق نے راقم الحروف کو سنایا تو رنج والم کی شدید لہر جسم وجاں پر لرزہ طاری کر گئی۔

ایک اور خبر کے مطابق عوامی کالونی کوٹ لکھپت میں اٹھارہ سالہ محنت کش نوجوان شہزاد حسین چھت پر اندھی گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ شہزاد حسین چھت پر ڈربے میں کبوتر بند کر رہا تھا۔ اس وقت مختلف اطراف پر پتنگ باز ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ نامعلوم طرف سے آنے والی گولی اس کو آ لگی جس سے وہ شدید زخمی ہو گیا، اسے جنرل ہسپتال لے جایا گیا مگر وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گیا (نوائے وقت، جنگ ۱۲ فروری ۲۰۰۱)

۱۲ فروری کے ہی روزنامہ ''جنگ'' میں ایک اور ہولناک خبر بھی شائع ہوئی۔ تفصیلات کے مطابق اعظم مارکیٹ میں دکان کی چھت پر پتنگ پکڑتے ہوئے ۱۶ سالہ شہزاد آصف کرنٹ لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ شہزاد آصف جو اپنے گھر کا واحد کفیل تھا، اعظم مارکیٹ میں ایک دکان پر ملازم تھا۔ وہ چھت پر بلب لگا رہا تھا کہ ایک پتنگ وہاں آ گری اس نے پتنگ کی ڈوری پکڑی تو دھاتی تار تھی جو بجلی کی تاروں میں الجھی ہوئی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مندرجہ بالا واقعات تو وہ ہیں جو صرف ایک دن کے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ بسنت کے دنوں میں ہونے والے واقعات کے اجتماعی اعداد و شمار کو جمع کیا جائے تو یہ سینکڑوں میں ہوں گے۔ بہت سے واقعات کا اخبارات میں شائع نہ ہونا بھی خارج از امکان نہیں۔ علاوہ ازیں بسنت کے تہوار میں زخمی ہونے والوں کا تو حساب ہی نہیں رکھا جاتا۔ اندرون شہر لاہور شاید ہی کوئی گلی یا محلّہ ہوگا جہاں اس طرح کے حادثات رونما نہ ہوتے ہوں۔ پاکستان کے دیگر شہروں میں بسنت کی وبا کافی پھیل چکی ہے، وہاں بھی صورت حال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

مذکورہ تین واقعات تین واقعات کی خبروں کے ساتھ ساتھ اخبارات نے یہ بھی رپورٹ کیا ہے کہ ان علاقوں کے رہائشی نے احتجاجی جلوس نکالے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ بسنت کے تہوار پر پابندی لگائے۔ معصوم یاسر عبداللہ کے والد محمد اشفاق نے حکومت سے دردمندانہ اپیل کی ہے کہ اس غیر اسلامی تہوار پر پابندی عائد کی جائے۔ مگر بے بس شہریوں اور مظلوم والدین کی فریاد سے سننے کا کس کے پاس وقت ہے؟ جس شہر میں حکومتی سرپرستی میں بسنت کا اہتمام جوش وخروش سے کیا جارہا ہو وہاں قتل کی ایسی وارداتوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کے علاوہ آخر کیا کیا جاسکتا ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معصوم یاسر عبداللہ کا خون کس کی گردن پر ہے؟ محنت کش نوجوان شہزاد کے مظلوم اہل خانہ کس کے ہاتھ پر خون تلاش کریں؟ دھاتی ڈور کے ذریعے کرنٹ لگنے سے جاں بحق ہونے والے جواں سال کی ہلاکت کا ذمہ دار کون ہے؟ ۶۰ لاکھ آبادی کے اس شہر میں کیا کوئی یہ اخلاقی جرات رکھتا ہے کہ وہ بے گناہ شہریوں کی قتل وغارت کے ان واقعات کی ذمہ داری قبول کرے۔ یہ درست ہے کہ حکومت کے کسی ذمہ دار فرد کے ہاتھوں یہ ہلاکتیں نہیں ہوئیں، مگر شہریوں کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری حکومت کی اولین ذمہ داری ہے اس لئے ارباب بست وکشاد اپنے آپ کو ایسے معاملات میں بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ حکومتی ذمہ داران کی طرف سے گزشتہ کئی برسوں سے پتنگ بازی کے دوران دھاتی ڈور استعمال کرنے والوں کے خلاف سخت اقدامات کا اعلان کیا جاتا رہا، مگران اعلانات کا بے ضمیر پتنگ بازوں پر اتنا بھی اثر نہیں ہوا جتنا اثر کسی کے کان جوں رینگنے سے ہوتا ہے شہر لاہور میں گلی بازاروں میں دھاتی ڈوریں بنائی جاتی ہیں ان قاتل ڈوروں پر پابند تو درکنار انکے بنانے والوں سے موثر باز پرس تک نہیں کی جاتی۔ جب کوئی حادثہ ہوتا ہے تو قانون نافذ کر والے ادارے حرکت میں آتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان المناک حادثات کے وقوع پذیر ہونے کا انت کیوں کیا جاتا ہے؟ خودکار اسلحہ سے فائرنگ ہمیشہ سے ایک غیر قانونی عمل قرار دیا جاتا رہا تقریباً تمام حکومتیں جر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیشہ افراد سے اسلحہ واپس چھیننے کی مہم برپا کرتی رہی ہیں مگر بسنت کے تہوار پر تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر دوسرے گھر میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ جس ملک میں اسلحہ کی نمائش بھی غیر قانونی ہو تعجب ہے وہاں ایک صوبائی صدر مقام میں اس قدر دھڑلے سے فائرنگ بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے لاہور شہر میں پورے پنجاب کی تقریباً ایک تہائی (تقریباً بیس ہزار) پولیس فورس تعینات ہے، اس قدر کثیر پولیس فورس اگر آہنی عزم کے ساتھ اس فائرنگ کے ذمہ دار افراد کو گرفتار کرنا چاہے تو یہ امر مشکل نہیں ہونا چاہیے مگر معاملہ پولیس فورس کی کثرت یا قلت کا نہیں ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ امن و امان کو قائم رکھنے کے ذمہ داروں میں بسنت جیسے تہواروں کی ہلاکت انگیزی کا صحیح احساس نہیں پایا جاتا۔ وہ شاید اب تک اسے محض ایک موسمی تہوار سمجھتے ہوئے عوامی تفریح میں عدم مداخلت کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ سمگلروں اور جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری کے لئے تربیت یافتہ پولیس اور دیگر ایجنسیاں آخر دھاتی ڈور بنانے والے مجرمانہ ذہنیت کے حامل افراد کو ڈھونڈھ نکالنے میں مایوس کن حد تک ناکامی کا شکار کیوں ہیں؟

دنیا کا کوئی ملک ایک ثقافتی تہوار کے نام پر کسی بھی گروہ کو عوام کی زندگیوں سے یوں کھیلنے اور ہلڑ بازی مچانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ پاکستان تو ایک اسلامی ریاست ہے، کسی سیکولر ریاست میں بھی اس طرح کی بدنظمی، فائرنگ اور دھاتی ڈور کے استعمال کی اجازت دینے یا اس سے چشم پوشی کرنے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ جس طریقے سے آزادی اظہار اور آزادی عمل لامحدود نہیں ہے اسی طرح تفریح منانے کی لامحدود ''آزادی'' دینے کا کوئی ملک متحمل نہیں ہو سکتا۔ جان اسٹورٹ مل نے بہت ٹھیک کہا تھا کہ ایک فرد کو اپنا ہاتھ پھیلانے کی محض اس حد تک آزادی ہے کہ اس کا ہاتھ دوسرے فرد کی ناک کو نہ چھوئے۔ جدید مذہب معاشروں میں کسی ایسی تفریح کو گوارا نہیں کیا جاتا جو دوسرے شہریوں کی زندگی کو عذاب بنائے۔ امریکہ اور یورپ میں شراب پینے پر پابندی نہیں ہے۔ مگر وہاں اگر کوئی شرابی گلی محلے میں آ کر غل غپاڑہ برپا کرے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے اور امن عامہ میں خلل اندازی کرنے کے جرم میں اسے مقدمہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں پتنگ باز ساری رات مجنونانہ فائرنگ کر کے اپنے آس پاس کے علاقوں میں ایک دہشت اور خوف کی فضا برپا کر دیتے ہیں ان کی ہلڑ بازی سے کوئی شریف آدمی سکون کی نیند نہیں سو سکتا، نگران کی اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہلڑ بازی کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت عوامی رائے کا احترام کرتے ہوئے بسنت کے تہوار کے موقع پر لوگوں کو زندگیوں کے تحفظ کی ذمہ داریاں نبھائے۔ اگر کسی بھی وجہ سے حکومت اس ہندوانہ تہوار پر مکمل پابندی نہیں عائد کر سکتی تو کم از کم اس کے بھیانک نتائج میں کمی لانے کے لئے مناسب قانون سازی اور موثر اقدامات تو اٹھا سکتی ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ گنجان آباد علاقوں میں گلی محلوں میں چھتوں پر پتنگ بازی پر پابندی عائد کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دی جائے پتنگ بازی کی اجازت محض کھلے میدانوں پارکوں میں ہونی چاہیے جہاں پتنگ کی ڈور کے بجلی کی تاروں میں الجھنے کا خدشہ نہ پایا جاتا ہو اور جہاں سے کسی اندھی گولی کے لگنے کا امکان نہ ہو۔ حکومت کو چاہیے کہ بسنت کے موقع پر فائرنگ کرنے والوں کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نمٹے۔ دھات کی ڈور تیار کرنے والوں کو گرفتار کر کے سزائیں دی جائیں اس معاملے میں اگر نئی قانون سازی کی ضروریات پیش آئے تو ایسا ضرور کیا جائے، حکومتی ذرائع ابلاغ میں بسنت کے تاریخی پس منظر کو بیان کیا جائے اور لوگوں کی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ بسنت کے تہوار کے متعلق سرکاری سرپرستی کے تصور کو ختم کیا جائے۔ اس سال بسنت کے متعلق پہلے سے زیادہ جوش وخروش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گزشتہ برس لاہور میں بسنت سرکاری سرپرستی میں منائی گئی تھی۔ سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بسنت منانے پر پابندی عائد کی جائے۔ اہل حکومت کو اب احساس ہو جانا چاہیے کہ جنونیوں کو کنٹرول کے لئے محض اخلاقی ہدایات کافی نہیں ہیں۔

مذہب اور ثقافت ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر بھی۔ ہمارے ہاں عام طور پر مذہب اور ثقافت کو دو الگ الگ تہذیبی دائروں کے طور پر زیر بحث لایا جاتا ہے، یہ زاویۂ نگاہ قطعاً درست نہیں۔ سیکولر طبقہ اپنے مذہب بیزار رویے کی وجہ سے ثقافتی امور میں مذہب کے کردار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے لہٰذا جہاں کہیں مذہب اور ثقافت کے درمیان رشتوں کی بات ہوتی ہے، وہ ہمیشہ مذہب کی تخویف اور ثقافت کی تعریف وتوصیف کا اسلوب اختیار کر لیتا ہے۔ یہ طبقہ تناقض فکر میں مبتلا ہے۔ اسے مذہب سے والہانہ وابستگی تو سخت ناگوار گزرتی ہے، مگر ثقافت سے جنون کی حد تک لگاؤ پر کسی قسم کا عقلی اعتراض نہیں ہوتا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سیکولر طبقہ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ثقافت کو ہی مذہب کا درجہ دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں مغرب زدہ روشن خیالوں کا ایک گروہ ثقافت کو تو قدیم اور پائیدار سمجھتا ہے اس کا خیال ہے کہ ایک قوم پر ثقافت کے اثرات اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ مذہب انہیں جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، مگر ایسا محض وہی لوگ سوچتے ہیں جو انسانی تاریخ کے ارتقا سطحی انداز سے لیتے ہیں۔ اگر وہ تہذیب وتمدن کے آغاز وارتقاء پر غور فرمائیں تو انہیں اپنی اس سطحی سوچ پر شاید ندامت کا احساس ہو کیونکہ جن اقدار اور سرگرمیوں کو آج وہ خالصتاً ثقافتی اور تہذیبی اقدام سمجھتے ہیں ان کا حقیقی پس منظر مذہبی ہی ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے دور اول میں مذہب کا انسانی معاشرے پر بہت گہرا اثر رہا ہے اس دور میں مذہبی اور الہامی تعلیمات کے خلاف عقلی بغاوت کا تصور تک نہیں تھا، اس لئے قدیم انسانی معاشرے میں کسی ایسے تہوار یا ثقافتی سرگرمی کا رواج پانا ممکن نہیں تھا جس کی تائید مذہبی تعلیمات سے نہ ہوتی۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق کرۂ ارض پر قدم رکھنے والا پہلا انسان اللہ تعالیٰ کا فرستادہ پیغمبر تھا یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔ اس کے بعد انبیاء کرامؑ کا ایک طویل سلسلہ ہے جو وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے۔ انبیاء کرامؑ کے زیر اثر جو تہذیب وتمدن فروغ پایا، اس کی اساس یقیناً مذہبی ہی تھی اگرچہ بعد میں مذہب کے جزوی روگردانی کی صورتیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی نمودار ہوئی لیکن مذہب کی اساسی تعلیمات کا اثر کبھی بھی کلیتاً ختم نہیں ہوا۔ کسی ثقافتی سرگرمی کے صحیح یا غلط، جائز یا ناجائز قرار دینے میں ہمیشہ مذہب کو معیار اور میزان تسلیم کیا گیا۔ ایسی ثقافتی سرگرمیاں جو مذہب کے اساسی تصورات سے متصادم نہیں تھیں۔ انہیں بالعموم جائز قرار دیا گیا، اس کے برعکس مذہبی روح سے ٹکرانے والی اقدار و سرگرمیوں کو ناپسندیدہ قرار دے کر لہو لعب گردانا گیا۔ ثقافت اور مذہب کے باہمی رشتوں کی موزونیت کا تعین کرنے کے لئے آج بھی قابل اعتماد معیار وہی ہے۔ اس معیار اور میزان کو قائم رکھنے سے ہی معاشرے کا توازن قائم رکھا جاسکتا ہے۔

اقوام عالم کے معروف ترین تہواروں کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مخصوص پس منظر رکھتے ہیں۔ یہودیوں کا سب سے بڑا تہوار ''ھنوکا'' ایک مذہبی تہوار ہے۔ اعداد و شمار کے اعتبار سے عیسائیت کو دنیا کا سب سے بڑا مذہب سمجھا جاتا ہے، عیسائی معاشرے میں کرسمس اور ایسٹر بے حد خوش وخروش سے منائے جاتے ہیں۔ ہندومت کا شمار قدیم مذاہب میں ہوتا ہے۔ ہندو معاشرے میں مختلف تہوار منائے جاتے ہیں۔ مثلاً دیوالی، دسہرا، ہولی، بیساکھی، بسنت وغیرہ۔ ان تمام تہواروں میں ادا کی جانے والی رسومات کو ہندومت میں مذہبی عبادات کا درجہ حاصل ہے۔ دیوالی، دسہرا اور ہولی کے متعلق تو سب جانتے ہیں کہ یہ ہندوؤں کے مذہبی تہوار ہیں، مگر بیساکھی اور بسنت وغیرہ کے متعلق یہ غلط فہمی عام پائی جاتی ہے کہ یہ موسمی اور ثقافتی تہوار ہیں۔ ایسا صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جو ان تہواروں میں حصہ تو لیتے ہیں، البتہ ان کا پس منظر جاننے کی زحمت انہوں نے کبھی گوارا نہیں کی۔

اسلامی تاریخ کے قابل فخر محقق اور سائنس دان علامہ ابوریحان البیرونی تقریباً ایک ہزار سال قبل ہندوستان تشریف لائے تھے۔ انہوں نے کلر کہار (ضلع چکوال) کے نزدیک ہندوؤں کی معروف یونیورسٹی میں عرصہ دراز تک قیام کیا، وہیں انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب الہند تحریر کی۔ یہ کتاب آج بھی ہندوستان کی تاریخ کے ضمن میں ایک مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے باب 76 میں انہوں نے ''عیدین اور خوشی کے دن'' کے عنوان کے تحت ہندوستان میں منائے جانے والے مختلف مذہبی تہواروں کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں عید بسنت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ البیرونی لکھتے ہیں۔

''اسی مہینہ میں استوائے ربیعی ہوتا ہے، جس کا نام بسنت ہے، اس کے حساب سے اس وقت کا پتہ لگا کر اس دن عید کرتے ہیں۔ اور برہمنوں کو کھلاتے ہیں دیوتاؤں کی نذر چڑھاتے ہیں۔''

بسنت کو آج کل ''پالا اڑنت'' کا نام دے کر موسمی تہوار بتایا جاتا ہے مگر اس کا ذکر البیرونی کے بیان میں نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ البیرونی کے بیان کے مطابق ہندو جوتشی ہر سال استوائے ربیعی کا تعین کر کے یوم بسنت کا اعلان کرتے ہیں۔ یہی تصور آج تک چلا آرہا ہے۔ بیساکھی کا تہوار بیساکھی کے مہینے میں گندم کی کاشت کے موقع

بقیہ صفحہ ۲۶ پر دیکھیں

© rasailojaraid.com